Gohar e tehqeeq گوہر تحقیق
گورنمنٹ صادق کالج ویمن یونیورسٹی بہاول پور
Year 2022; Vol 01 (Issue 01)
P. 01-11 https://journals.gscwu.edu.pk/

نعمان نذیر
پی ایچ ڈی اسکالر، اردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

Noman Nazir
PhD. Scholar Urdu, International Islamic University Islamabad (IIUI)

ناول "قلعہ جنگی" اور اکیسویں صدی کا سماجی وسیاسی منظر نامہ

Socio Political Study of Novel" Qila Jangi" in the Perspective of 21st Century

Abstract:

9/11 took place at all the beginning of 21st century. Immediate after this incident world scenario changed rapidly. America, attacked directly on Afghanistan to save itself and another world. War brings disaster and cases new human tragedies. This war targeted a specific nation and religion. Novelist took Qila Jangi, few Km away in historic Mazar-e- Sharif city of Afghanistan as locate where an operation launched. Militants surrender before US army but few in hesitation threw grenade on them. In response US army killed hundred people. Among at the dead, there were Arabs, Chechen's, Pakistani, and us citizens. Therefore, narrated the story of that characters who reached there how and why? At the one handed the under developed country's peoples are livings belas poverty line where is the people of rich countries have their inner pain and miseries. These two major causes gathered these people for shake of sacred war by so called leaders. Novelist exposes the role of these leaders in this novel. In this article efforts have been made to take into account the factors of article, social religious side in the story.

Key Words: world scenario, Militants, narrated, miseries, sacred war, disaster.

اردو ادب کے بعض بڑے ناول نگاروں کے ہاں یہ پہلو دکھائی دیتا ہے کہ ان کے ہاں کرداروں میں مماثلت یا ایک ناول کے کردار دوسرے میں اس کا تسلسل ہی دکھائی دیتے ہیں۔ مستنصر حسین کا خاصا یہ ہے کہ ان کے ناولوں کے نہ صرف کردار بلکہ ان کے مو

ضوعات ، بلکہ عہد بھی الگ ہو تا ہے جہاں مشابہت کا کوئی شائبہ دکھائی نہیں دیتا۔ مستنصر حسین تارڑ کا نام ناول نگاری اور سفر نامہ نگاری کے حوالے سے ایک نمایاں مقام رکھتا ہے۔ اردو ادب میں ان کا خاص لب ولہجہ اور ان کی وسعت نظری ان کو خاص مقام پر فائز کراتی ہے۔ ان کے ناولوں میں تہذیبی، تاریخی و سماجی مسائل کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ناول " قلعہ جنگی " بظاہر ایک عالمی یا تاریخی واقعہ کی علامت کے طور پر دکھائی دیتا ہے۔ لیکن اس میں کئی انسانی، سماجی المیے بھی پوشیدہ ہیں۔ ناول نگار کے ہاں گہرا سماجی شعور ہے جو بیک وقت مختلف علاقوں اور خطوں سے تعلق رکھنے والے کرداروں کو ان کے تہذیب و ثقافت کے معیار پر پورا اترتے ہوئے دکھاتا ہے۔ مبین مرزا اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> "مستنصر حسین تارڑ نے اس ناول میں تہذیبی سطح پر تو ان مسائل کو نہیں دیکھا ہے۔ البتہ اخلاقی، سماجی اور معاشی صورت حال کے پس منظر میں افغانستان کے اس تاریخی المیے کو فوکس کیا گیا ہے جو عصری تناظر میں اس کی ثقافتی پامالی اور انسانی زندگی کو درماندگی و بے توقیری کا نقشہ ابھارتا ہے۔"(1)

نئی صدی کے آغاز میں جہاں ایک طرف انسان نے ترقی کی منازل تیزی سے طے کیں وہیں طاقتور اپنا تسلط قائم کرنے کے لئے نئے اور پرانے حربے استعمال کرتے ہوئے انسانیت کو پامال کرتا دکھائی دیتا ہے۔

9/11 کے بعد دنیا کے حالات میں بڑی حد تک تبدیلی واقع ہوئی امریکہ نے افغانستان پر براہ راست حملہ کر کے دہشت گردوں کو ختم کرنے اور بقول ان کے پوری دنیا کو ان کے خطرات سے محفوظ بنایا۔ 9/11 کے واقعے نے پوری دنیا بطور خاص جنوبی ایشیاء کے اس خطے کے سیاسی و سماجی منظر نامے میں بڑے پیمانے پر تبدیلی پیدا کر دی۔ امریکہ کے افغانستان پر براہ راست حملے کے صورت میں پاکستان سب سے زیادہ متاثر ہوا۔ پاکستان سیاسی و سماجی حوالے سے ایک اہم دور سے گزرا۔ پاکستان کے ساتھ ساتھ پاکستانی ادیبوں نے افغانستان میں پیش آنے والے انسانیت سوز المیوں سے متاثر ہو کر اپنے جذبات کو الفاظ کے قالب میں ڈھالا۔ ڈاکٹر نجیبہ عارف اس ضمن میں رقمطراز ہیں:

> "یہاں اس بات پہ بحث کرنا مقصود نہیں کہ یہ رویہ کس حد تک جائز اور یک طرفہ ہے۔ یہاں صرف اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ جب بھی ملکی سیاست یا معاشرتی زندگی کے افق پر کوئی قابلِ ذکر واقعہ رونما ہوا ،اُردو ادیبوں نے اپنی تخلیق کا موضوع ضرور بنایا ہے۔"(2)

اس کے سیاسی محرکات سے قطع نظر ناول کے تناظر میں مصنف نے بڑے گہرے مشاہدے کے تحت اس کے اثرات و وجوہات کو فنکارانہ انداز میں ناول کے دامن میں سمویا ہے۔ افغانستان کے مشہور اور تاریخی شہر مزار شریف سے چند کلو میٹر دور فاصلے پہ قلعہ جنگی واقع ہے۔ 18 اٹھارہویں صدی میں تعمیر ہونے والے اسی تاریخی قلعہ کے نام اس ناول کا عنوان بھی ہے۔ شمالی علاقوں کے لوگوں کے سامنے جنگجوؤں نے جن میں پاکستانی، عرب، امریکی، برطانوی، چیچنیا، مشرق وسطیٰ کے لوگ شامل تھے ہتھیار ڈال دیئے ۔ ان کو ہاتھ باندھ کے قلعہ جنگی کے صحن میں لایا گیا تا کہ ان سے مزید پوچھ گچھ کی جاسکے۔ پکڑے جانے والے لوگوں کی ایک کثیر تعداد تھی۔ چند افراد نے گھبراہٹ اور خوف کے عالم میں ہینڈ گرینڈ اُچھال دیئے۔ چند ایک نے فائرنگ بھی کی جس کے نتیجے میں ایک خون کی ایسی ہولی کھیلی گئی امریکی طیاروں نے بمباری کی جس کے نتیجے میں سینکڑوں کی تعداد میں لوگ مر گئے۔ گولی بارود اس کے اس بھیانک کھیل میں محض امریکیوں کے خلاف بر سرِ پیکار لوگ ہی نشانہ نہیں بنے بلکہ عام لوگوں کی تعداد بھی اس سے کم نہیں۔

ناول کی کہانی بھی اسی قلعہ جنگی کے تہ خانے میں 7 زخمی دوستوں کے گرد گھومتی ہے جو اس حادثے میں بچ جاتے ہیں۔ یہ اس قدر زخموں سے چور ہیں کہ اپنی موت کا انتظار کرنے کے سوا ان کے پاس کوئی چارہ نہیں ہے۔ ناول کی اصل خوب صورتی یہ ہے کہ اس میں کوئی بھی پہلو یک طرفہ نہیں دکھایا گیا بلکہ بڑے ہی اچھے انداز میں ایسے پہلوؤں کو قابل ذکر بنایا گیا ہے کہ جن سے عمومی طور پر تاریخ دان اور بہ حیثیت مجموعی عام شخص جانتے ہوئے بھی بات کرنا پسند نہیں کرتا۔

> "قلعہ جنگی افغانستان پر امریکی حملے کے بعد کی قومی اور انسانی صورت حال کو موضوع بناتا ہے۔ اس وقت یہ علاقہ اور اس کے انسان ابتدا اور ہزعمیت کے جس تجربے سے گزرے اس کے ان کے مزاج پر کیا اثرات ہوئے کہ تفتیش کے لیے اس ناول میں تہذیب اور ریاست کا علاقائی نقشہ اور عالمی تناظر میں قوموں، ملکوں کی بدلتی ہوئی تقدیر اور طاقت ور اقوام کے مفادات کے ایجنڈے کی تکمیل کے لیے پیدا کیے گئے حالات اور استعمال کی نئ صورت اور اقدمات کو پیش کیا گیا ہے۔" (3)

عالمی منظر نامے کی تبدیلی اور بین الاقوامی سطح پر ترجیحات کا ذکر کیا گیا ہے۔ امریکہ نے روس کو توڑنے کے لیے بڑے پیمانے پر جہادیوں کی حوصلہ افزائی کی۔ پاکستان کی مدد سے اس نے روس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ اس کے بعد ان لوگوں سے لاتعلقی کا اظہار کر دیا۔ جنہوں نے اس کو کامیاب کرانے میں اہم کردار ادا کیا۔ بعد ازاں اس نے اپنے مفادات کے حصول کے لیے انہی لوگوں کو دہشت گرد قرار دے کر ان کو خود بھی مارا اور آپس میں بھی لڑوایا۔

"جب افغانستان پر روس نے حملہ کیا تو ہزاروں عرب ادھر آ نکلے اور القاعدہ سے متاثر ہوئے۔ امریکہ اور یورپ کی آنکھوں کے تارے جن کی جھولیاں ڈالروں اور ہتھیاروں سے بھری جاتی تھیں۔ یہ وہی مجاہدین اور ہیرو تھے جو 9/11 کے بعد دہشت گرد بن گئے۔ پہلے یہ جہاد تھا کہ روس مد مقابل تھا اور اب یہ دہشت گردی ہے کہ وہ اپنا دفاع کر رہے تھے۔"(4)

یہ وہ گھناؤنی سازش تھی کہ دونوں طرف شہادت کے متلاشی ایک ہی عقیدے کے لوگ ایک دوسرے کے ساتھ بر سرپیکار تھے ۔اسی آڑ میں عام سادہ لوح لوگوں کی ذہن سازی کر کے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا گیا۔ اقوامِ عالم پر اپنی بالا دستی قائم کرنے کے لئے جس منافقت کا سہارا لیا گیا اس کا نشانہ مخصوص اقوام اور مذہب کے لوگ ہی بنے۔ ایک طرف وہ مارے جا رہے ہیں اور دوسری طرف خوف و دہشت کی علامت اس پوری قوم اور مذہب کو قرار دیا جاتا ہے۔ ناول کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"وہ کسی ۔۔۔ شریعت یا شہادت ۔۔۔ یا جہادی ملا کے فلسفے سے متاثر ہو کر صدق دل سے ۔۔۔ اگرچہ کچی عمر کی ناپختہ فہم کے صدق دل سے ۔۔۔ ادھر آ نکلا تھا ۔۔ اسے کچھ پتہ نہ تھا کہ اس کے مد مقابل جو کافر ہوں گے وہ شاید اس سے کہیں بڑھ کر پرہیز گار ۔۔ شریعت کے پابند اور باریش ہوں گے اور وہ بھی شہادت کے طالب ہوں گے"۔(5)

یہ سات دوست مختلف ملکوں، علاقوں اور مختلف طبقاتی حیثیت کے نمائندے ہیں۔ زخموں سے چور یہ قلعہ جنگی کے تاریک تہہ خانے میں موجود ہیں۔ یہاں انسانی المیہ بھی ہے کہ بہ حیثیت انسان چاہے جس حال میں بھی ہو وہ اپنے بقاء کی کوشش کرتا ہے۔ زندگی اس کو بہر حال پیاری ہوتی ہے وہ اس کی حفاظت کرتا ہے۔ اس حال میں ہوتے ہوئے بھی وہ بقا کی کوشش کرتے ہیں۔ قلعہ جنگی کے صحن سے زخمی گھوڑے کو نیچے لے آتے ہیں تا کہ وہ کچھ دیر مزید زندہ رہ سکیں۔ ناول کے یہ کردار جو بظاہر ظالم، دہشت کی علامت لیکن زخموں کے ناسور بنتے، بدبودار حالت اور اپنی غلاظت میں اٹے ہوئے یہ کردار قاری کے دل میں ہمدردی کے جذبات بھی پیدا کرتے ہیں۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس گھوڑے کو اپنی خوراک بنانے پر مجبور ہیں۔ جو ان کے مذہب میں جائز نہیں۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ ایک مردہ تعفن زدہ گھوڑا۔ ناول نگار اس موقع پہ انسان کو انسانیت کے مقام سے اس سطح پہ لے آتا ہے کہ دشمن ہو تب بھی ایک عام فہم آدمی بھی اس موقع پہ نوحہ کناں نظر آتا ہے۔

"جب وہ گھوڑے کے گوشت کے لوتھڑے دونوں ہاتھوں میں تھامے انہیں اپنے منہ کے قریب لاتے تھے تو اُبکائیوں سے دوہرے ہوتے انہیں پرے کر دیتے ان کے بدنی نظام میں

کچھ بھی باقی نہ تھا اور نہ وہ قے کر دیتے۔۔۔۔وہ کوشش کرتے لیکن جونہی لوتھڑے کا ماس
ان کے لبوں کو چھوتا تو وہ پھر اُبکائیاں لیتے لیتے نڈھال ہو جاتے "۔(6)

ناول میں مختلف کرداروں کے ذریعے جس میں سات مرکزی کردار یہی لوگ ہیں جو زخمی حالت میں قلعہ جنگی کے تہہ خانے میں موجود ہیں۔ان کرداروں نے مختلف رازوں سے پردہ اُٹھایا ہے۔ان میں مرتضیٰ ایک پاکستانی نوجوان ہے جس کا تعلق ایلیٹ کلاس سے ہے۔تمام آسائشیں اور سہولتیں اسے میسر تھیں جو ایک امیر آدمی کو حاصل ہوتی ہیں۔اس کا باپ ایک ریٹائرڈ جنرل ہے جس نے روس کے خلاف جہاد میں بے پناہ دولت بنائی اور کئی فیکٹریوں کا مالک ہے۔اچانک مرتضیٰ اس کھوکھلی عیش و عشرت بے مقصد زندگی سے تنگ آکر اپنے باپ کے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کی غرض سے جہاد افغانستان کے کارندوں تک پہنچ جاتا ہے اور یوں وہ اس نظام کا حصہ بن جاتا ہے۔جس کی اصل حقیقت اسے بھی معلوم نہیں۔اس کے باپ کے کردار کے چند تلخ حقائق کو بیان کیا گیا ہے کہ ایسی جنگوں، ایسے جہادوں میں ایک خاص طبقہ کس طرح اپنے ذاتی فوائد حاصل کرتا ہے۔بعض اوقات وہ آگ جو دوسروں کے لیے جلائی جاتی ہے اس میں خود ان کو بھی جلنا پڑ سکتا ہے۔ناول میں موجود اللہ بخش اور گل شیر ولی کا کردار استحصالی نظام کو بھی ظاہر کرتا ہے کہ لوگ کس طرح ایک نظام سے راہ فرار اختیار کرتے ہوئے دوسرے استحصالی نظام کا با آسانی شکار ہو جاتے ہیں۔

اللہ بخش کے کردار کے ذریعے ناول نگار نے بڑے خوب صورت انداز میں دیہات میں نچلے طبقے کے مسائل کو بیان کیا ہے۔اللہ بخش کا تعلق ایک نچلے گھرانے (میراثی) سے ہے۔جس کی کوئی معاشرتی حیثیت نہیں وہ گاؤں کے چوہدری کے رحم و کرم پر ہے۔ان کی زندگی کے فیصلے بھی وہی کرتے ہیں ان کو کھانے کے لیے انہی سے کچھ مل جاتا ہے۔جو لوگ شہروں میں چلے جاتے ہیں اور مشہور ہو جاتے ہیں وہ آرٹسٹ بن جاتے ہیں باقی رہ جانے والے اس طرح صدیوں پرانی چاکری کر کے اپنی زندگی گزار دیتے ہیں۔وہ اسی عذاب سے بچنے کے لیے مدرسے چلا جاتا ہے جہاں اس کو وہ ملتا ہے جو اسے گاؤں میں نہ ملا۔

"ادھر ہمارے پاس جتنے بھی ذرا سخت طبیعت والے مولوی اور مدرسوں کے طالب علم ہیں
ان میں بڑی تعداد میرے جیسے کمی کمینوں کی ہے پوچھو کیوں ؟۔۔۔۔ایک تو یہ کہ ادھر
روٹی پانی کا بندوبست ہو جاتا ہے ۔۔سب لوگ برابر ہوتے ہیں کیونکہ میرے سوہنے
رسول ﷺ نے اعلان فرمایا کہ رنگ نسل اور قبیلہ برادری کچھ نہیں سب برابر ہیں"(7)

اللہ بخش جیسے سادہ لوح اور معاشرہ کے جبر کا شکار نوجوان بڑی آسانی سے ان طاقتوں کا آلہ کار بن جاتے ہیں۔نام نہاد ملا ان کو جنت کا پروانہ تھما کر اپنے عزائم کے لیے استعمال کرتے ہیں۔روحانی سکون کی تلاش ہو یا مادی ضروریات کی تکمیل کی جستجو یہ نوجوان بڑی آسانی سے ان لوگوں کا شکار بنتے ہیں۔انہیں تو صرف اپنی معاشی بدحالی سے نجات چاہیے۔انہیں تو محض دو وقت کی روٹی چاہیے۔ان

کی سوچوں پہ اس طرح حاوی ہو جاتے ہیں کہ ان کے ذہنوں میں یہ سوال ابھرتا ہی نہیں کہ وہ مولوی جو ان ہی جیسا ہے ان کی سرپرستی کرتا ہے اس کے پاس یہ تمام مال و دولت کہاں سے آتی ہے۔ ان کو تو اپنا ماضی بھلانا ہوتا ہے۔ غربت بہت سے مسائل کی جڑ سہی لیکن اس کے محرکات سے صرف نظر اصل مسئلہ ہے۔ عدم مساوات سرمایہ دارنہ نظام اس کی اصل جڑ ہے جو مخصوص معاشرے نہیں بلکہ ایک عالمی مسئلہ ہے۔ احساس محرومی بہت سے مسائل کی جڑ ہے اس احساس کی آبیاری کر کے غریب ملکوں کے لوگوں کو اپنے مقاصد کے حصول کے لئے اپنا آلہ کار بنانا ان کے لئے کوئی مسئلہ نہیں۔ ان غریب لوگوں کے مقامی رہنما اور ہمدرد بھی سب کچھ جاننے کے باوجود انہیں اس کی بھینٹ چڑھا کہ اپنا فائدہ ضرور حاصل کرتے ہیں۔

> "بڑے مولوی صاحب کی بڑی مشہوریاں تھیں۔۔ اسلام آباد میں بڑا اثر ورسوخ تھا اور حکومت والے بھی ان سے ڈرتے تھے۔ پر دوسرے مدرسے کے طالبان ہمیں بڑا چھیڑا کرتے تھے کہ تمہارا مولوی سینڈوچ ہے۔ اللہ معاف کرے جہنمی کہتے تھے کہ نیچے کوئی اور اوپر کوئی اور۔۔۔۔۔ پتہ نہیں مجھے تو سمجھ ہی نہیں آتی یہ کیا بہتان ہے۔۔۔ پر بھائی مجھے کیا۔۔ مجھے تو حیاتی میں پہلی بار تین کپڑے اور تین وقت کا کھانا ملا تھا۔۔۔ اور کوئی مجھے بخشو میراثی نہیں کہتا تھا بلکہ سب حضرت اللہ بخش کہتے تھے۔(8)

ایک اور کردار گل شیر ولی کا ہے جس کا تعلق پاکستان کے شمالی علاقہ جات دیر سے ہے۔ یہ بھی ایک استحصالی نظام کا شکار کردار ہے۔ اس کا باپ نواب کا ملازم ہے جو اس کے اصطبل میں گھوڑوں کی دیکھ بھال کرنے پر مامور تھا۔ جہاں سے ملنے والا تھوڑا معاوضہ اور گھوڑوں کا چوری شدہ دانہ گل شیر ولی اور اس کے بہن بھائیوں کا پیٹ بھرتا تھا۔ محنت مزدوری کرنے کے باوجود ان کو پیٹ بھر کے کھانا بھی نہ ملتا تھا۔ گل شیر ولی کے باپ کو ذلیل اور بے عزت کر کے محض اس وجہ سے ملازمت سے نکال دیا جاتا ہے کہ برسوں گھوڑوں کی لید صاف کرنے والا نواب کے گھوڑے پر بیٹھا کیوں۔

> "ہمارا بوڑھا خوشی خوشی گھوڑا بن گیا یارا۔۔۔۔۔ نواب چابک مارتا تھا تو وہ اور خوش ہوتا تھا کہ ہمارا قسمت کتنا اچھا ہے کہ نواب خود چابک مارتا ہے۔۔۔ بوڑھا نے اس کو میدان پورا چکر لگوایا اور اسے خوش کرنے کو گھوڑا کے موافق بولا بھی۔۔۔۔ لیکن نواب خوش نہ ہوا یارہ ہمارا بوڑھا کو نوکری سے رخصت کر دیا(9)

اللہ بخش کی طرح گل شیر ولی بھی اپنی غربت اور بدحالی سے بچتا ان نام نہاد مولویوں کے ہاتھوں چڑھ کے جہاد کے عظیم فریضے کو سرانجام دینے کے لیے اپنے ہی جیسے کلمہ گو لوگوں کے خلاف برسرپیکار ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ناول میں ابو طالب (چی چی) جس

کا تعلق چیچنیا سے ہے، وہاب جو آل سعود ہے، ہاشم جس کے باپ کا تعلق کشمیر (پاکستان) سے تھا لیکن وہ برطانیہ کی پیدائش اور وہاں کا شہری تھا۔ ایک امریکہ کا شہری، یہودی خاندان سے تعلق رکھنے والا نو مسلم جس کا پرانا نام جان واکر ہے یہ کردار شامل ہیں۔ ناول میں بھی اسے جانی کے نام سے ہی مخاطب کیا گیا ہے۔ ابو طالب کا تعلق چیچنیا کے ایک تباہ حال اسلامی گھرانے سے ہے جسے اس کے والدین کے انتقال کے بعد اس کی دادی نے پالا اور پھر خواب میں دیکھا کہ وہ جہاد کے عظیم فریضے کے لیے اس خطے میں آئے اس کو بھی اس کے مخصوص حالات آج اس قلعے تک لائے تھے۔

عبد الوہاب کا تعلق آل سعود سے ظاہر کیا گیا ہے جو عام عربوں کی نسبت برطانیہ میں کیمبرج میں زیر تعلیم تھا اور اپنی غیر معمولی صلاحیتوں سے سب کو حیران کر دیتا ہے۔ اس کا باپ ایک امیر آدمی تھا۔ جس کا نقشہ ناول نگار نے بڑے مفصل انداز میں کھینچا ہے۔ لیکن اس ساری ذہانت قابلیت کے باوجود اس کے اندر اس بات کی خلش تھی کہ یہ سب بے مقصد ہے۔ وہ مقصدیت کے حصول کے لیے یہاں آیا تھا۔ اس کردار کے ضمن میں ناول نگار نے عربوں کے امرا کا نقشہ بھی بڑے محققانہ انداز میں کھینچا ہے۔ کس طرح وہ قدرتی دولت سے مالا مال ہونے کے بعد اس دولت کو محض اپنے سامان تعیش کے طور پہ اڑاتے ہیں۔ ان کے ہاں مقصدیت کا فقدان ہے۔ دین کو بھی انہوں نے اپنی مرضی کے مطابق ڈھال رکھا ہے۔ جرمنی میں کاروبار کے سلسلے میں کی جانے والی عیاشی کے احوال جو اس کے باپ کے دوست نے اسے بتا رکھے تھے۔

جانی واکر جو کہ امریکہ کا شہری ہے اور ناول کے اختتام تک ناول کے کینوس تک موجود رہتا ہے۔ یہ کردار اپنے اندر بہت سے رازوں کو چھپائے ہوئے ہے۔ اس کے یہودی باپ کے درمیان ہونے والی گفتگو اور مکالمے بھی مصنف کی زیرک فہمی کو ظاہر کرتے ہوئے ناول کو مزید دلچسپ بنا دیتے ہیں۔ جانی واکر کے والد کے لیے اس کا اسلام قبول کرنا ایک حیرت انگیز اقدام تھا بلکہ اس پہ زیادہ ستم تو یہ کہ اس نے جہاد کی غرض سے مشرقی ممالک جانے کا فیصلہ بھی کر لیا تھا۔ ان کی گفتگو کے درمیان چند ایک ایسی بحثیں بھی سامنے آتی ہیں جو اپنے اندر ایک تلخ حقیقت کو چھپائے ہوئے ہیں۔ مغرب کا پراپیگنڈا اپنی جگہ لیکن کچھ خامیاں تو یہاں بھی تھیں لیکن دوسری طرف دیکھا جائے تو یہی پودے پنپ کر پیڑ اور درخت بنے جس کی داغ بیل ان لوگوں نے خود رکھی اور بعد میں سارا قصور وار انہی کو ٹھہرایا گیا۔

> "تم ان جاہل اور وحشی ملاؤں کا ساتھ دینے جا رہے ہو جنہوں نے افغانستان کو پتھر کے
> زمانے میں دھکیل دیا ہے۔ جانی۔۔ جہاں رباب بجانا جرم ہے۔۔۔ فٹ بال کے نوجوان
> کھلاڑیوں کے سر مونڈھ دیئے جاتے ہیں کیونکہ وہ نکریں پہن کر کھیل رہے ہوتے ہیں اور
> یوں ان کی ٹانگیں دیکھ کر ملاؤں کے ایمان خراب ہوتے ہیں۔ تمام عورتوں کو برقعوں میں

دفن کر دیا جاتا ہے اور بچیاں سکول نہیں جاسکتیں ۔۔۔ہسپتالوں میں لیڈی ڈاکٹروں کو جواب دے دیا گیاہے۔اور وہ برقعہ اوڑھے کابل کی گلیوں میں بھیک مانگتی ہیں۔۔مردوں کی داڑھیاں مٹھیوں میں بھینچ کر ناپی جاتی ہیں اور اگر ان کے بال مٹھی سے باہر نہ نکلیں تو انہیں بید مارے جاتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔جانی خدا کے لیے تم کیسے نظام کی مدافعت کے لیے جارہے ہو" (10)

ان دلائل پہ مبنی گفتگو کے باوجود وہ اپنے فیصلے پر قائم رہتے ہوئے افغانستان کارخ کرتا ہے۔ناول نگار نے مغرب کے وہ تصورات بہت واضح انداز میں بیان کئے ہیں جو مشرق خصوصاً اسلامی معاشروں کے لئے قائم ہیں،ایک عام مغربی آدمی کو بھی ان تصورات سے آگاہی ہے جو انہوں نے مشرق کے متعلق قائم کر رکھے ہیں۔وہ اپنے معاشرے کے کا نام روشن خیال اور جدیدیت سے تعبیر کرتے ہیں۔اور اگر کوئی دوسرا اپنے مذہبی،ثقافتی ورثے کو اپنانے کی سعی کرے تو اسے پتھر کے زمانے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

ناول میں ایک کردار ہاشم کا ہے۔جس کے والد کا تعلق آزاد کشمیر کے علاقے سے ہے لیکن اس نے اپنا کاروبار وہیں بنا رکھا ہے۔۔ہاشم وہیں کی پیدائش اور برطانوی شہری ہے۔ہاشم کے والد کا کردار اس طبقے کا نمائندہ کردار ہے جو ہمیشہ اپنے مالی فوائد کے لیے اہل مغرب کی طرف نہ صرف متوجہ ہوتے ہیں بلکہ اپنی ساری ہمدردیاں بھی ان کے لیے وقف کر دیتے ہیں۔۔لیکن یہ طبقہ نوآبادیات کے زیر سایہ پلنے والی ذہنیت کی بھی عکاسی کرتا ہے۔وہ محض اپنا فائدہ مقدم رکھتے ہوئے ہر لحاظ سے اہل مغرب کو اپنے سے بہتر سمجھتے ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ اپنے آپ کو متقی و پرہیزگار ثابت کرنے کی بھی کوشش کرتے ہیں۔

اس کے باپ نے غیر قانونی طور پر دو پاکستانی مزدوروں کو اپنے کام کے لیے رکھا ہوا ہے۔اپنی بیٹی کے لیے بھی وہ پاکستان سے رشتہ ڈھونڈ کر لاتا ہے جو نوجوان محض برطانوی شہریت حاصل کرنا چاہتا ہے۔کچھ عرصہ کے بعد وہ مار پیٹ سے تنگ آکر طلاق لے کر ایک ہوٹل میں ویٹر کی نوکری کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔اس کا باپ رشتے کے بدلے بھی رقم لے کر ایک مکان خرید لیتا ہے۔اس کے لیے پیسہ سب سے زیادہ ضروری اور لازم ہے۔اس تمام صورتحال کے باوجود وہ نمازی بھی ہے اور مساجد کی تعمیر میں حصہ بھی لیتا ہے۔اس کردار کے ذریعے نہ صرف پاکستان بلکہ برصغیر سے باہر جانے والے ہزاروں خاندانوں کی ذہنیت اور ذہنی کشمکش کی عکاسی کی گئی ہے۔وہ اپنی آسائشوں،شان و شوکت کے لیے مغرب کو ترجیح تو دیتے ہیں۔لیکن اس کے کلچر اور ثقافت کے اثر کو جب اپنی اولاد پر پڑتا دیکھتے ہیں تو ان کے لیے وہ امر قابل قبول نہیں ہوتا۔وہ ہاشم کے وہاں سے آنے کے بعد بھی یہی گمان کرتا ہے کہ اس کا بیٹا کسی گوری سے شادی کر کے چلا گیا ہے۔

ہاشم ان مذہبی اکابرین کا بھی تذکرہ کرتا ہے جو قیامت کا وعظ سنا کے قبر کے عذاب سے خوف زدہ کر کے اپنے چندوں کے حصول کے لیے مغرب کا رخ کرتے ہیں۔ دیکھا جائے تو دلچسپ امر یہ ہے کہ ان مذہبی علما کے جن کے خاندان بھی یورپ میں آباد ہوتے ہیں، پاکستان کے لوگ ان کو یورپ میں دین کی اشاعت کا داعی سمجھتے ہیں جو دراصل اپنے کاروبار چلانے وہاں جا کر بھی چندہ مہم کرتے ہیں
۔

ہاشم کے اندر داخلی کرب ہے۔ وہ اس کھوکھلی زندگی سے اکتا کر روحانی تسکین کے حصول کے لیے ادھر کا رخ کرتا ہے۔ ہاشم اس نسل کا نمائندہ کردار ہے جن کے سامنے نہ تو مذہب کی صحیح تفہیم کرنے والے لوگ ہیں نہ ان کو اس داخلی کرب سے نجات دلانے والے۔ اگر وہ بہتری کی جانب گامزن ہونے کی کوشش کرتے بھی ہیں تو ان کو مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔۔ مشرق میں وہ جس چیز کے حصول کے لیے آیا وہاں بھی اسے قول و فعل میں تضاد ہی دکھائی دیتا ہے۔ وہ تو مایوس ہو جاتا ہے کہ یہاں تو اسے کسی چیز کو سمجھنے کی بھی اجازت نہیں دی جاتی۔

> "اگر برطانوی معاشرے کی اقدار مجھے اپنے باپ کی تعظیم کرنے سے روک سکتی تھیں تو میں طالبان کو بھی تو پرکھ سکتا تھا۔۔ لیکن میں نے دیکھا کہ یہاں پرکھنے کی ہر گز اجازت نہیں ہے۔ ایک جانب عورت اتنے بلند مقام فضیلت پر فائز ہے کہ وہ ہمارے رسول اللہ ﷺ پر سب سے اول ایمان لاتی ہے۔ اسی سے ان کی نسل آگے بڑھتی ہے اور دوسری جانب اسے ایک جانور بنا دیا جاتا ہے اور صرف اس کے ٹخنے نظر آ جانے پر اسے سر بازار بید سے پیٹا جاتا ہے۔۔۔ ایک فٹ بال سٹیڈیم میں ایک بڑے ہجوم کی موجودگی میں اسے ایک باپردہ حالت میں۔۔۔ برقعے میں لپیٹ کر شوٹ کیا جاتا ہے۔۔۔ طالبان کو پرکھنے کے لیے اور بھی بہت کچھ تھا۔۔۔۔۔ یہ میرا کائناتی تصور ہر گز نہ تھا۔۔۔(11)

ہاشم طالبان کے نظریات کی حقیت کو جان جاتا ہے۔۔ اس خود ساختہ نظام کی اصل حقیقت کو وہ سمجھ جاتا ہے لیکن وہ اپنے ساتھیوں اپنے دوستوں کی خاطر وہاں سے نہیں جاتا۔ ناول نگار نے بڑے عمدہ انداز میں ان کرداروں کو تخلیق کیا ہے۔ یہ کردار اپنی خصوصیات، ثقافت، تہذیب و معاشرت میں سب الگ ہیں سب کی سماجی و معاشرتی حالت مختلف ہے۔ جو وسیع تر مفہوم اور معانی کے تناظر کے متقاضی ہیں۔ ناول محض ایک خاص شعور کا حامل نہیں بلکہ اس کے اندر سیاسی و عسکری معاملات سے ہٹ کر تہذیبی، معاشرتی اور انسانی نفسیاتی مسائل کی عکاسی جا بجا ملتی ہیں۔ انسان کی مادی ضروریات اور روحانی تقاضے اس کی تشفی کے لیے ضروری ہیں۔ لیکن تاریخ عالم پر نگارہ دوڑائی جائے تو ان دونوں تقاضوں کو کمزوری بنا کر لوگوں کا استحصال کیا جاتا رہا ہے۔

"مستنصر حسین تارڑ نے اس واقعے کو بڑی مہارت سے اپنے ناول میں منفرد اسلوب بیان سے برتا ہے۔اس ناول کی بدولت قعلہ جنگی کا خوف ناک سانحہ تاریخ و ادب کا ان مٹ نقوش بن گیا۔بالکل اسی طرح جلیاں والہ باغ کا واقعہ فکشن کا حصہ بننے کے بعد امر ہوا۔اردو ادب میں افغانستان کے پس منظر میں قابل رشک مواد موجود نہیں ہے۔ لیکن مذکورہ ناول میں اس موضوع پر صرف ایک واقعہ کی عکس بندی نے اردو ادب کو ثروت مند بنادیاہے۔جو مستنصر حسین تارڑ کے فن کا اختصاص ہے۔"(12)

ناول نگار نے بڑے عمدہ انداز میں ان کرداروں کو تخلیق کیا ہے۔یہ کردار اپنی خصوصیات، ثقافت، تہذیب و معاشرت میں سب الگ ہیں سب کی سماجی و معاشرتی حالت مختلف ہے۔جو وسیع تر مفہوم اور معانی کے تناظر کے متقاضی ہیں۔ناول محض ایک خاص شعور کا حامل نہیں بلکہ اس کے اندر سیاسی و عسکری معاملات سے ہٹ کر تہذیبی، معاشرتی اور انسانی نفسیاتی مسائل کی عکاسی جابجا ملتی ہیں۔ انسان کی مادی ضروریات اور روحانی تقاضے اس کی جمعیت کے لیے ضروری ہیں۔ناول نگار کا اختصاص یہ ہے کہ مختلف معاشروں کی عکاسی کرتے ہوئے نہ صرف ان کرداروں کا بیان بلکہ سیر حاصل بحث ان معاشروں کے حوالے سے بھی ملتی ہے۔ناول نگار نے غربت اور آسودگی دونوں طرح کے معاشروں کی عکاسی کی ہے۔ترقی پذیر ممالک میں غربت کو کمزوری بناکر آسانی سے لوگوں کی وفاداریاں اور ان کے تصورات کو خریدا جاسکتاہے۔ تاہم وہ معاشرے جو دوسروں کے حقوق کے علمبردار بنے بیٹھے ہیں ان کے اپنے ہاں لوگ کس طرح ذہنی اذیت کا شکار ہیں یہ موازنہ بھی قابلِ ستائش ہے۔

مذہبی لحاظ سے ہو یا سیاسی و سماجی لحاظ سے ان لوگوں کو محتاج بناکر اور پھر ان کی بہتری کے لیے بظاہر کوشاں ہو کر ان کو اعتماد میں لے کر بہت ہی آسانی سے ان کو اپنا شکار بنالیا جاتا ہے۔خواہ وہ ایک عام بیج ذات اللہ بخش ہو یا ہاشم اور جانی واکر جیسا تہذیب یافتہ اور جدیدیت کے حامل معاشرے کا کردار ہو، پھر ان کو اپنے مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کرنا نہ تو مشکل ہوتا ہے اور نہ ہی ناممکن ۔ناول کے سیاسی، پہلوان کرداروں کے ذریعے سے بہت حد تک واضح ہو جاتے ہیں۔ان کرداروں کا المیہ دراصل معاشرتی المیہ ہے

حوالہ جات

1۔ نجیبہ عارف، ڈاکٹر، "11/9 اور پاکستانی اردو افسانہ"، پورب اکادمی اسلام آباد 2001ء، ص 21،22

2۔https://www.rekhta.org/articles/hum-kahan-qismat-aazmane-jayein-mubeen-mirza-articles?lang=ur

3۔ مرازمبین،اکیسویں صدی کے دوعشروں میں اردوناول پر اجمالی نظر؛سہ ماہی ادبیات ناول نمبر جلد دوم اسلام آباد جون۔
2022ء۔ ص61

4۔فوزیہ چوہدری،ڈاکٹر،"11/ 9کے اردوناول پہ اثرات":مشمولہ،پاکستانی زبان وادب پر 11/ 9کے اثرات،پشاور،اگست
2010ء،ص97

5۔ مستنصر حسین تارڑ،"قلعہ جنگی"،سنگِ میل پبلی کیشنز،2008اہورء،49

6۔ ایضاً،ص،86

7۔ ایضاً،ص،103

8۔ ایضاً،ص،108

9۔ ایضاً،ص

10۔ ایضاً،ص،122

11۔ ایضاً،ص،97

12۔خان محمد شعیب،ڈاکٹر،"مستنصر حسین تارڑ کے ناول قلعہ جنگی کا فکری وفنی مطالعہ"،سہ ماہی ادبیات ناول نمبر جلد دوم اسلام
آبادجون2022ء۔ص254،253ء